بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

پاکستان کہاں کھڑا ہے؟

خرم مراد

۱۴ اگست کو ہم پاکستان کے یوم آزادی کی ۴۸ ویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ سال گرہ کا دن جشن سے زیادہ خود احتسابی کا دن ہے۔ اس لیے کہ اس دن امتحان عمل کی جو مہلت سنت الٰہی --- وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ --- کے تحت ہمارے لیے مقرر کی جا چکی ہے وہ ایک سال کم ہو جائے گی، اور ہمارے دفترِ عمل میں ایک سال کے اوراق کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے بھی کہ، سنتِ الٰہی ہی کے تحت، قومی ترقی و سربلندی، قوت و دولت اور عزت و غلبہ انھی قوموں کا مقدر ہے جو اپنا احتساب آپ کرتی ہیں، اپنی بدعملیوں، غلط کاریوں اور خامیوں کا اعتراف کرتی ہیں، اپنی حالت میں تغیر و اصلاح کے لیے کمربستہ ہو جاتی ہیں، اور اگر مومن ہوں تو اپنے رب کی طرف واپس آتی ہیں:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو، ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نصف صدی کے قریب طویل مہلت کے دوران ہم نے اپنا دفترِعمل کتنا سیاہ کیا ہے اور کتنا روشن، یہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ اور، اس سفرِ زندگی نے ہمیں کس آگ کے گڑھے پر پہنچا دیا ہے، یہ بھی ہم پر خوب عیاں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آگ ہمارے اعمال کے ایندھن ہی سے بھڑک رہی ہے: عداوت اور بغض کی آگ، افتراق اور انتشار کی آگ، خون ریزی اور آبرو ریزی کی آگ، غیروں کے آگے ذلت اور اپنوں کے ہاتھوں رسوائی کی آگ۔ ھِیَ اَعْمَالُکُمْ تُرَدُّ عَلَیْکُمْ، یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو تم کو واپس کر دیے جاتے ہیں۔

آج کا یہ پاکستان، بدقسمتی سے، اس سے مختلف نہیں ہے، جس کی نشان دہی ہم نے ۱۹۹۲ میں کی تھی:

آزادی کی اس سال گرہ کے موقع پر، پاکستان جن سنگین مسائل اور مہیب خطرات سے دوچار

ہے' ان کی نوعیت [عام نہیں بلکہ] بالکل ہی دوسری ہے۔ استحکام' سلامتی اور بقا سب داؤں پر لگے ہوئے ہیں۔ ہر چیز کے مستقبل پر' یہاں تک کہ ملک کے مستقبل پر بھی' بے یقینی کے گہرے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کل کیا ہو گا' کوئی یقین کے ساتھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن کوئی سنگین سے سنگین بات بھی ایسی نہیں رہ گئی جس کا ہونا ناقابل تصور یا خارج از امکان سمجھا جاتا ہو: سیاسی نظام تلپٹ کیا جا سکتا ہے' امن و امان تہ و بالا ہو سکتا ہے' خون ریزی کی آگ بھڑک سکتی ہے' فوج اور قوم باہم دست بگریبان ہو سکتے ہیں' ملک لخت لخت ہو سکتا ہے۔ ملک کی کشتی یقین کے بجائے شک' امید اور حوصلے کے بجائے یاس و ہراس' اتحاد کے بجائے افتراق' اور دیانت و وفا کے بجائے بد دیانتی' لوٹ کھسوٹ اور بے وفائی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے"۔

(ترجمان القرآن' اگست ۹۲' ص ۳)

یہ تو قومی زندگی کی مجموعی کیفیت ہے۔ الگ الگ دیکھیں تو کوئی شعبہ زندگی ایسا نہیں — سیاست ہو' معیشت ہو' زراعت و صنعت ہو' تعلیم ہو' اخلاق و کردار ہو — جس میں روز بروز نااہلی' ناکارکردگی' لوٹ کھسوٹ' بگاڑ اور انحطاط میں مسلسل اضافہ نہ ہو رہا ہو۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ آج ایک پاکستانی دنیا میں کہیں سر اٹھا کر نہیں چل سکتا' اسے ہر جگہ ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب ملک کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اس پر اس کا دلِ دردمند خون کے آنسو نہ روتا ہو۔

یہ بگاڑ اور انحطاط کیوں کر پیدا ہوا ہے؟ اس کا کوئی ایک سبب نہیں' نہ ساری ذمہ داری کسی ایک عنصر پر ڈالی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ اس کے اصل ذمہ دار ہمارے وہ حکمران ہیں جن کے ہاتھوں میں قومی زندگی کا اسٹیرنگ رہا ہے۔ یہ حالت کوئی ایک دن یا ایک دورِ حکومت میں بھی نہیں ہو گئی' نہ صرف آج کے حکمرانوں کو اس کے لیے ملامت کرنا صحیح ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کا یہ عمل روزِ اول ہی سے مسلسل جاری ہے' اور' قائداعظم کے بعد' بلا استثنا کوئی حکمران ایسا نہیں گزرا ہے جس کا دامن پاک ہو' اور جو آئین و قانون شکنی' مطلق العنانی' طاقت کے ناجائز استعمال' جبر و تشدد' ہوسِ اقتدار' قومی مقاصد اور مفادات سے غفلت' قومی معاملات چلانے میں نااہلی' غیروں کی غلامی اور ان کے آگے گدائی' (اور سوائے چند کے) بد دیانتی اور لوٹ کھسوٹ کے ان جرائم کا مرتکب نہ ہوا ہو جن کے نتیجے میں قوم بالتدریج پستی اور پس ماندگی کے گڑھے میں گرتی رہتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ایک قوم کو ویسے ہی حکمران اور لیڈر ملتے ہیں جیسی وہ خود ہوتی ہے' دودھ میں زہر ہو تو زہریلا مکھن ہی اوپر آئے گا۔ یقیناً عام لوگوں کو ان کی ذمہ داری سے بری نہیں کیا جا سکتا'

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ۴۸ سال تک ان حکمرانوں کو لانے اور نکالنے میں ان کی آزاد مرضی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں رہا' اور ۱۹۸۸ سے بھی جو تھوڑا بہت اختیار انھیں ملا ہے' وہ کئی سمتوں سے دباؤ اور ساز باز کا شکار رہا ہے۔

یہی پاکستان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ جن جاگیرداروں' فوجی جرنیلوں اور افسروں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ رہی ہے' سید مودودی کے الفاظ میں 'انھیں: "کوئی ایسی تعلیم و تربیت نہیں ملی ہے جس نے ان میں کوئی قومی کیرکٹر پیدا کیا ہو۔ انھیں اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ وہ بڑے مہذب لوگ ہیں' حالانکہ تہذیب محض انگریزی بگھارنے اور انگریزوں کے سے کپڑے پہننے اور انھی کی طرح رہنے سہنے کا نام نہیں ہے' بلکہ آئین و قانون کی پابندی' نظم و ضبط اور اپنے حدود کو سمجھنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ اور اس اعتبار سے [اکیسویں صدی کی دہلیز پر پہنچنے کے باوجود] ابھی یہ لوگ تہذیب کے اس مقام تک نہیں پہنچے ہیں جس پر اٹھارویں صدی کے وسط میں انگریز قوم کا ایک معمولی ٹامی فائز تھا"۔

تفصیل کی گنجایش نہیں' لیکن قومی زندگی کے بعض اہم دائروں میں ان حکمرانوں کے کردار اور کارکردگی کا مختصر سا جائزہ اس بات کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

ہر ملک میں مختلف گروہوں کے مفادات و مقاصد کے درمیان تصادم سے سیاسی بحران پیدا ہوتے ہیں' اور بعض دفعہ وہ پوری قوم کو بھی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ لیکن حکمران ہی انھیں حسن تدبیر سے حل کرتے ہیں۔ مگر پاکستان کے حکمران جب کسی سیاسی بحران سے دوچار ہوئے' یا جسے انھوں نے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ دیکھ کر بحران بنا لیا' اسے انھوں نے حل کرنے کے بجائے اپنی نااہلی' بے تدبیری اور غلط کاری سے مزید بگاڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر بحران نے ایک سنگین تر بحران کو جنم دیا' اور ہر بحران قوم کو تلخ سے تلخ تر نتائج کا تحفہ دیتا گیا' نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۷۱ میں ۱۹۴۷ کا پاکستان دو ٹکڑے ہو کر ختم ہو گیا' اور آج ۱۹۹۵ میں نیا پاکستان بھی سیاسی اور نسلی تصادم اور محاذ آرائی کے ایک بظاہر لاینحل بحران کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قائداعظم کے جانشین اخلاص و بے لوثی' فہم و فراست اور تدبر و تحمل کی ان صفات سے محروم تھے جو ان بحرانوں کو حل کرنے کے لیے ضروری تھیں۔ اس پر مستزاد' وہ ہر قیمت پر طاقت سے چمٹے رہنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہر مخالفت و اختلاف' ہر سیاسی عمل اور ہر جمہوری ادارے کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھا۔ چنانچہ جب کوئی بحران پیدا ہوا' انھوں نے 'سیاست کاری کے

سارے اصول بالائے طاق رکھ کے ، صرف طاقت کے بل پر ان کو ختم کرنا چاہا: عام قانون کی طاقت ، وہ ناکافی لگی تو من مانے قانون کی طاقت ، اس سے بھی کام نہ بنا تو قانون شکنی کر کے لاقانونیت کی طاقت ۔ اسی طرح انتظامیہ اور پولس کی قوت بھی استعمال کی ، اور فوج کی قوت بھی ، کبھی پس پردہ اور کبھی کھلم کھلا مارشل لا اور فوج کشی کی صورت میں ۔

بحران کے حل میں طاقت کا ایک مقام ضرور ہے: سیاست کاری کی پشت پر طاقت کا موجود ہونا ضروری ہے ، اور بعض حالات میں طاقت کا استعمال بھی ناگزیر ہو سکتا ہے ۔ لیکن تجربہ یہی ہے کہ طاقت سے جنگ تو لڑی جا سکتی ہے ، بحران حل نہیں ہوتا اور فتح بھی یقینی نہیں ہوتی ۔ ایک آزاد ملک کے آزاد باشندوں کے ساتھ نہ جنگ لڑنا مطلوب ہو سکتا ہے ، نہ ان کو مفتوح بنانا ۔ پھر طاقت کے کارگر ہونے کے بارے میں سارے دل خوش کن اندازے بھی بالعموم غلط نکلتے ہیں ، مطلوبہ نتائج بھی شاذ و نادر ہی برآمد ہوتے ہیں ۔ بحران اور تصادم بڑھتا ہی ہے ، اندرونی ہو یا بین الملکی ۔ کوریا ، ویت نام ، بیروت ، صومالیہ ، الجیریا ، کینیا ، آئرلینڈ ، فلسطین ، بوسنیا ، چیچنیا ، مشرقی پاکستان ، بلوچستان --- تاریخ ، ناکامی کے تجربات سے بھری ہوئی ہے ۔

طاقت کے استعمال سے مفر ممکن نہ ہو ، تو اس کے کارگر ہونے کا کچھ امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ صحیح وقت پر استعمال ہو ، صحیح لوگوں کے خلاف ہو ، صحیح مقدار میں ہو ، عدل و شفقت کے ساتھ ہو ، اور جلد از جلد اپنے اہداف حاصل کر کے اسے ختم کر دیا جائے ۔ اس کے ساتھ ساتھ دل جیتنے ، شکایات دور کرنے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے موثر اقدامات بھی ضروری ہیں ۔ ڈھاکہ میں ان تمام اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ، اب کراچی میں بھی وہی غلطیاں دہرائی جا رہی ہیں ۔

بحران کو حل کرنے کا مسلمہ اصول یہی ہے کہ طاقت کی منطق کے بجائے ڈپلومیسی کی منطق کو ہمیشہ ترجیح دی جائے اور مذاکرات ، افہام و تفہیم اور اتفاق رائے سے قابل قبول حل تلاش کیے جائیں ۔ جہاں حکومت شہریوں کی ہو ، شہریوں کے لیے ہو ، اور سب شہریوں کے حقوق مساوی ہوں ، وہاں طاقت کے استعمال کا جواز مشکل ہی سے نکل سکتا ہے ۔ خوارج حضرت علی ؓ کی تکفیر کرتے تھے ، برملا آپ کو قتل کرنے کی بات کرتے تھے ۔ لیکن آپ یہی فرماتے کہ جب تک وہ میرے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتے میں نہیں اٹھاؤں گا ، اور جب تک وہ قتل کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتے میں انھیں سزا کیسے دے دوں ۔ سیاست کاری اور مذاکرات کی کامیابی کے لیے تحمل ، وسیع الظرفی ، نیک نیتی اور لین دین ضروری ہوتا ہے ۔ مفاہمت و مذاکرات کا ایک خاص وقت ہوتا ہے ۔ مفاہمت کا رویہ نہ ہو اور وہ وقت گزر جائے تو تلخ نتائج یقینی بنتے جاتے ہیں ۔ ان دونوں ضروریات کا ادراک بھی ہمارے ہاں مفقود رہا ہے ۔ کراچی

کا حالیہ بحران ' درج بالا تمام پہلوؤں سے موجودہ حکمرانوں کی نااہلی اور بے تدبیری کا منہ بولتا نمونہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے معاملے کی تدبیر بھی اسی انداز میں کی گئی۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کا مسئلہ کسی بھی فیڈریشن میں ایک بحران بن سکتا ہے۔ پاکستان کے جغرافیے ' لسانی اور نسلی تقسیم اور فوج اور بیوروکریسی میں ایک طبقے کے غلبے کی مخصوص نوعیت نے اس مسئلے کو ایک بارود کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو اس کا کوئی ادراک نہ تھا۔

فروری ۴۸ میں بنگالی کو سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ دستور ساز اسمبلی میں اٹھایا گیا۔ لیاقت علی خاں نے ' اس مطالبے کو تفرقہ اندازی قرار دیتے ہوئے ' اعلان کیا کہ اردو ہی قومی زبان ہوگی ' قائداعظم نے یہی اعلان مارچ میں ڈھاکہ میں دہرا دیا ' خواجہ ناظم الدین نے فروری ۱۹۵۲ میں ڈھاکہ میں پھر اس کی تکرار کر دی۔ کسی نے اس پر بات چیت کی ضرورت نہ سمجھی۔ اردو تو آج تک سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے ' لیکن بنگالی کے حق میں تحریک شروع ہوگئی ' مظاہرے ہوئے ' اس تحریک کو بحران بنا لیا گیا ' لاٹھی ' گولی اور جیل سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ' لاشیں گریں ' شہید مینار تعمیر ہو گیا ' اور بالآخر ۱۹۵۴ میں ' ۶ سال بعد ' بنگالی کو ایک قومی زبان کے طور پر تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن اس پورے عمل نے بنگالی قومیت اور علیحدگی کی تحریک کی بنیاد رکھ دی۔

۱۹۵۴ میں مشرقی پاکستان کے انتخابات میں مسلم لیگ کو عبرت ناک شکست ہوئی اور یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت قائم ہوگئی۔ حکمرانوں کے لیے یہ بھی ایک بحران تھا۔ چنانچہ چند ہی ماہ میں سکندر مرزا کو گورنر لگا دیا گیا ' وزارت کو برطرف کر دیا گیا ' وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے فضل الحق کو غدار قرار دیا---- "وہ علیحدگی کے لیے سازشوں میں مصروف تھے" ---- اخباروں پر سنسر لگا دیا گیا ' بڑے پیمانے پر لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ فضل الحق پہلے مرکزی وزیر داخلہ اور پھر گورنر بنے ' سہروردی وزیراعظم بنے ' مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا جذبہ بھی مزید مستحکم ہوگیا۔

مرکز میں مقتدرین کے درمیان تقسیم اختیار کا مسئلہ بھی ۱۹۵۳ سے ۱۹۹۲ تک مسلسل ایک بحران بنا رہا ہے۔ یہ مسئلہ ' مشرقی پاکستان کے ساتھ تقسیم اختیارات کے مسئلے کے ساتھ خلط ملط ہوگیا۔ ان مسائل کو مفاہمت کے ذریعے حل کرنے کے بجائے ' فوج اور بیوروکریسی کی قوت کے بل پر ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا ' پھر ۱۹۵۴ میں دستور ساز اسمبلی ہی کی بساط لپیٹ دی گئی ' اور بالآخر ۱۹۵۸ میں ۱۹۵۶ کا دستور منسوخ کر کے فوج بالکل سامنے آگئی۔ سیاسی عدم استحکام کے علاج کے نام پر کیے جانے والے اس اقدام کے نتیجے میں عدم استحکام تو آج تک بد سے بدتر

ہی ہوتا گیا ہے ' ہاں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا۔ اس کے باوجود ' ۱۹۶۹ کے بعد بھی ' اور ۱۹۷۱ کے انتخابات کے بعد بھی ' شدید ترین بحران کے باوجود ' مذاکرات و مفاہمت سے پاکستان کو ایک رکھنے کی راہ نکل سکتی تھی اور ہم بربنائے شواہد یقین رکھتے ہیں کہ بنگالیوں کی بھاری اکثریت پاکستان سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھی ' لیکن اس بحران کو حل کرنے کے لیے بھی ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر دی گئی۔ اس فوج کشی کے ملبے کے نیچے ۱۹۴۷ کا ۲۵ سالہ جوان رعنا پاکستان ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔

سیاست مسلسل بحران کا شکار اس لیے ہے کہ ہر حکمران نے اپنے اقتدار کی ہر مخالفت کو تفرقہ انگیزی اور ملک دشمنی قرار دیا ' مخالفین کو غدار قرار دیا ' اور ان کے استیصال کے لیے ہر قسم کے قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کیے۔ مگر بالآخر سب خود ہی غیر قانونی ذرائع کا شکار ہو کر رخصت ہو گئے اور خود ساختہ "بحران" اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ ایوب خاں بڑے طمطراق سے آئے ' سارے سیاست دانوں کو سیاست بدر کیا ' پھر اپنی پارٹی بنائی ' مگر جب عوامی مخالفت کی لہر اٹھی تو حوصلہ ہار دیا ' ۱۹۵۶ کے اس دستور کو ضمیر کی ادنیٰ سی خلش کے بغیر توڑ چکے تھے جس کی وفاداری کا حلف اٹھایا ' اب اپنے ہی بنائے ہوئے دستور کو توڑا ' حکومت فوج کے سپرد کر دی۔ جنرل ضیاء الحق ۹۰ دن میں انتخابات کرا دینے کا وظیفہ پڑھتے ہوئے آئے مگر دس سال جمے رہے ' اپنے اقتدار کی خاطر اس حد تک گئے کہ "ووٹ اسلام کو دو ' منتخب پانچ سال کے لیے ضیاء الحق ہو جائے گا"۔ بھٹو کو پھانسی ہوئی اور طاقت کے ذریعے پیپلز پارٹی کے "بحران" کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ' لیکن بالآخر خود طیارے کی تباہی میں گئے ' اور ان کے جاتے ہی پیپلز پارٹی فوراً بر سر اقتدار آگئی ' اور آج بھی ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں کے اس طرز عمل کے پیچھے ان کی نفسیات ' سوچ اور رویوں کے سرچشموں کا کھوج لگانا کچھ مشکل نہیں۔ یہ بالعموم جاگیردار و سرمایہ دار تھے ' یا فوجی جنرل اور سرکاری افسر۔ جو جاگیردار تھے ' انھیں جاگیریں انگریز کی وفاداری ' اس کے ساتھ مل کر نافرمان رعایا کو کچلنے اور انگریزی فوج کی توپوں کے لیے جوانوں کا چارا فراہم کرنے کے صلے میں ملی تھیں۔ ان کی عزت و ذلت انگریزی افسر کے دربار میں کرسی کے مقام اور اس کی طرف سے سند تعریف اور خطابات سے وابستہ رہی تھی۔ یہ خود کو اپنی جاگیر کی زمین ' پیداوار ' مزارع ' اس کی بیوی اور بہو بیٹی کا مطلق العنان مالک سمجھتے تھے ' ان کی جاگیر میں ان کی مرضی ' ان کا لفظ ہی قانون ہوتا تھا ' وہ اپنی جاگیر کو جس طرح چاہتے تھے لوٹ سکتے تھے۔ اسی نفسیات و کردار کے ساتھ انھوں نے پاکستان کی حکومت سنبھالی اور سوچا کہ پاکستان کی صورت میں اب ان کو ایک بڑی جاگیر مل گئی ہے۔ فوجی جرنل بھی صرف "یس سر" سننے کے عادی ہوتے تھے ' ان

کے ماتحتوں کے لیے ان کا ہر لفظ قانون ہوتا تھا' انھیں ہر مسئلے کو ایک حکم جاری کر کے حل کرنے کی تربیت ملی تھی' مطالبے اور اختلاف اور حکم عدولی کا تصور بھی ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اور ایسی ہر "بغاوت" کا علاج ڈسپلن کرنا اور کورٹ مارشل کرنا ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے پاکستان کے معاملات کو بھی اسی انداز میں چلایا۔ چنانچہ معاملات بگڑتے گئے' اور آج ایک اور ربع صدی کے بعد' ہم اپنی تاریخ کے ایک اور خوف ناک بحران سے دوچار ہیں۔

قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں غفلت' نااہلی اور مفاد پرستی کی وجہ سے جس درجے کی بدتدبیری (mismanagement) کی گئی ہے' وہ ایک دوسری داستان عبرت ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لیے پورا دفتر کھولنا ہو گا۔ لیکن ہم صرف تین شعبوں میں جو نتائج نکلے ہیں وہ سامنے رکھیں گے۔ دیگ کے یہ چاول ساری دیگ کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ تعلیم: تعلیم کا جائزہ سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک تعلیم ترقی اور استحکام کی کلید اور بنیاد ہے۔ تعلیم صحیح ہو تو وہی اخلاق و کردار کی تعمیر کی ضمانت ہے' اور قوم کی امنگوں اور مزاج کی آئینہ دار ہو تو اس کے قبلے کو صحیح رخ پر رکھنے کا ذریعہ۔ بدقسمتی سے سب سے زیادہ تغافل' مجرمانہ تغافل' تعلیم ہی سے برتا گیا ہے۔ ایک کے بعد ایک رپورٹوں کے باوجود' اس کا قبلہ اور نہج درست نہیں ہوا۔ معیار روز بروز گر رہا ہے۔ اس نے قوم کو دو حصوں میں پھاڑ رکھا ہے۔ غیروں کے پیمانوں سے نتائج ناپیے' تو ایک اَلم ناک تصویر بنتی ہے:

۴۸ سال کی کوشش کے بعد بھی ہم صرف ۳۵ فی صد آبادی کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا سکے ہیں' عورتوں میں یہ تناسب صرف ۲۰ فی صد ہے۔ اس کے مقابلے میں بھارت میں یہ تعداد ۴۸ فی صد' ملایشیا میں ۷۸ فی صد' اور سعودی عرب میں بھی ۶۲ فی صد ہے۔

لازمی تعلیم کا خواب پورا ہونے کا امکان تو دُور دور نہیں' ابھی تک نصف سے زیادہ بچے (۵۴ فی صد) پرائمری میں داخل ہی نہیں ہوتے' ہونا چاہیں تو ان کے لیے اسکول ہی نہیں ہیں۔ جو بچے اعداد و شمار کی رُو سے اسکول جاتے ہیں' ان کے نصیب میں کیسے اسکول ہیں؟ دیہاتوں میں' جہاں ۷۰ فی صد آبادی رہتی ہے'، ۴۰ فی صد پرائمری اسکول بغیر عمارت کے ہیں' جبکہ سندھ میں ایسے اسکول ۵۵ فی صد ہیں۔ پنجاب میں کم از کم ۲۰ ہزار اسکول بغیر عمارت کے' اور ۱۵ ہزار صرف ایک کمرے پر مشتمل ہیں۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق پنجاب میں ۹۵ فی صد پرائمری اسکولوں میں صرف ۲ اساتذہ ۵ جماعتوں کو پڑھاتے ہیں' جبکہ سندھ میں ۵۶ فی صد سنگل ٹیچر اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ "اسکولوں کی

ایک کھیپ وہ ہے جو صرف کاغذوں پر موجود ہے' جن میں طلبہ غائب ہیں' مگر اخراجات مسلسل ہو رہے ہیں۔ جب حال یہ ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ جن ۴۶ فی صد بچوں کا پرائمری میں پڑھنا شمار ہوتا ہے' ان میں سے ۳۹ فی صد ایک سال بعد ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں' اور پانچویں کلاس تک مشکل سے صرف ۴۰ فی صد پہنچتے ہیں۔

مڈل اور ہائی اسکولوں کی حالت کچھ بہتر ہے' مگر ان کی تعداد پرائمری کی صرف ۱۴ فی صد ہے۔ چنانچہ اسکول جانے کے مستحق بچوں کی تعداد اگر ۱۰۰ ہے' تو مڈل اسکول میں صرف ۲۳ اور میٹرک میں صرف ۱۷ پہنچتے ہیں۔ ان میں سے ۵۰ فی صد میٹرک میں فیل ہو جاتے ہیں' ۷۰ فی صد انٹر میں' اور جو بچے کھچے تین چار طالب علم ڈگری لینے پہنچ جاتے ہیں' ان میں سے بھی ۷۰ فی صد بی اے' بی ایس سی میں فیل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے پاکستان میں ڈگری کے لیے پڑھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ آبادی پر صرف ۲۶۶ ہے' جبکہ یہی تعداد ایران میں ۸۵۸' عراق میں ۱۲۴۰' ملایشیا میں ۶۷۹' انڈونیشیا میں ۸۵۸ اور سعودی عرب میں بھی ۱۰۳۵ ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۲ کروڑ کی آبادی والے پاکستان کی ساری جامعات میں ایک لاکھ طلبہ بھی نہیں ہیں۔

اتنے شرم ناک نتائج کسی صنعت کے ہوں تو اسے فوراً بند کر دیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں کو بند تو نہیں کیا جا سکتا' لیکن کیا اس صورت حال کے ذمہ دار حکمرانوں کو بدلنا ناگزیر نہیں ہے؟

۲- زراعت: زراعت معیشت کا سب سے اہم شعبہ ہے' اس پر توجہ سب سے کم ہے۔ اگر زراعت کی اور دیہی آبادی کی ترقی کے لیے مناسب اور کماحقہ اقدامات کیے جاتے تو آج ملک معاشی طور پر خود کفیل اور مضبوط ہوتا۔ ہمارے پاس زرخیز زمین' وافر پانی اور محنتی دہقان ہے' لیکن ہمارے حکمرانوں نے آنکھ بند کر کے مغرب کے معاشی ترقی کے ماڈل کے پیچھے دوڑ لگا دی' اندر سے بھی سرمایہ کھینچا' باہر سے بھی مانگا یہاں تک کہ بال بال قرض میں جکڑ گیا' لیکن سب کچھ صنعت میں لگا دیا۔ چنانچہ زراعت کی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی گئی۔

آج بھی ۷۰ فی صد آبادی اور ۶۰ فی صد سے زیادہ لیبر فورس دیہاتوں میں رہتی ہے۔ زراعت کا شعبہ براہ راست اور بالواسطہ ۷۵ فی صد زرمبادلہ کماتا ہے' لیکن اس کی زبوں حالی کی وجہ سے ہمیں ۳۲ ارب روپے کا غذائی مواد درآمد کرنا پڑتا ہے' جو بچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود' پنج سالہ منصوبوں میں زراعت کا حصہ ۹.۵ سے گھٹتے گھٹتے اب ۳.۵ فی صد رہ گیا ہے اور مزید برآں ۱۹۸۱ تا ۱۹۹۰ کی دہائی میں ۱۵۶ ارب روپے کے وسائل زراعت سے کھینچ کر دوسرے شعبوں میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔

اگر ہم پاکستانی پنجاب کا موازنہ بھارتی پنجاب سے کریں' تو ہمارے ناخداؤں کی نااہلی بے نقاب

ہو جاتی ہے۔ہمارا رقبہ ایک کروڑ ستر لاکھ ہیکٹر ہے ' ان کا ۵۶ لاکھ ' ہمارا ۱۱ ، فی صد رقبہ زیر کاشت ہے ' ان کا ۴۸ فی صد ' ہماری ۸۵ فی صد کاشت کی آبپاشی ہو رہی ہے ' ان کی ۹۴ فی صد کی ' ہمارے پاس ڈیڑھ لاکھ ٹریکٹر ہیں ' ان کے پاس تقریباً دگنے ' یعنی پونے تین لاکھ ' ہمارے ہاں ۲ لاکھ ۸۳ ہزار ٹیوب ویل ہیں ' ان کے ہاں یہ بھی دگنے ' یعنی ۷ لاکھ ۳۷ ہزار ' ہم ۴ تا ۵ فی صد دیہاتوں تک بجلی پہنچا سکے ہیں وہ ۹۴ فی صد تک ' ان کے ہاں پختہ سڑکیں بھی ہم سے دگنی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تین گنا رقبے کے باوجود ' ہم ۷۵ لاکھ ہیکٹر زمین کاشت کر کے صرف ایک کروڑ پانچ لاکھ ٹن گندم پیدا کرتے ہیں ' وہ ۳۲ لاکھ ہیکٹر سے ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن ' ہم ۱۲ لاکھ کے رقبے سے ۱۴ لاکھ ٹن چاول حاصل کرتے ہیں ' وہ ۱۹ لاکھ کے رقبے سے ۷۰ لاکھ ٹن۔ چنانچہ ہم ہر سال ۸ ارب روپے خرچ کر کے ۲۰ لاکھ ٹن گندم درآمد کر رہے ہیں ' اس کے برعکس بھارتی پنجاب پورے بھارت کو گندم فراہم کر رہا ہے ' اور بھارت کے پاس تین کروڑ بیس لاکھ ٹن کا ذخیرہ ہے۔ اگر ہماری گندم کی صرف پیداوار بھارتی پنجاب کے برابر ہوتی تو ہمیں ۲۰ لاکھ ٹن درآمد نہ کرنا پڑتی ' ہمارے پاس ۷ لاکھ ٹن فاضل ہوتی۔

ہمارے دریاؤں کے سرمائی پانی کا ۶۵ فی صد ضائع ہو رہا ہے۔ ۱۲۵ ملین ایکرفیٹ پانی ہم آب پاشی کے لیے فراہم کر رہے ہیں ' اس کا صرف ۵ فی صد استعمال ہوتا ہے۔ ہمارا آب پاشی کا نظام تباہ حالی کا شکار ہے۔ ہمارے پاس ۹۰ لاکھ ہیکٹر قابل کاشت زمین ہے جس پر کچھ نہیں پیدا ہو رہا ' اس کی آب پاشی ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں کھاد کا استعمال ۴۰ اکلو فی ہیکٹر ہے ' جبکہ چین میں یہ ۳۲۰ کلو ' اور بنگلہ دیش میں بھی ۱۱۱ کلو ہے لیکن ہم نے ورلڈ بنک کے اصرار پر کھاد کی قیمتوں میں امداد ختم کر دی ہے ' جبکہ بھارت نے اپنے بجٹ میں ۴۵ ارب روپے اس مقصد کے لیے رکھے ہیں۔

۳۔ دفاع: تعلیم اور غذا کے بعد ' ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ اپنی سلامتی کے تحفظ کا ہے۔ ہم --- تعلیم ' صحت ' زراعت ' صنعت ' رسل و رسائل ' سب کا پیٹ کاٹ کر ' دفاع پر اپنی آمدنی کا نصف حصہ خرچ کرتے رہے ہیں۔ لیکن نتائج کیا ہیں؟

۱۹۷۱ میں ہم ملک کی سلامتی کے تحفظ میں بری طرح ناکام ہوئے ' اور آدھا پاکستان کھو دیا ' ہماری ۹۰ ہزار فوج نے پوری طرح لڑے بغیر بھارت کے آگے ہتھیار ڈال دیے ' مغربی پاکستان بھی امریکہ کی مداخلت کی وجہ سے بچا۔ ہماری اسٹرے ٹیجی غلط مفروضوں اور خوش فہمیوں پر مبنی تھی: ہم سمجھتے تھے کہ ہندستان ہم پر حملہ نہیں کرے گا ' کرے گا تو ہم نپٹ لیں گے ' چین ہماری مدد کو آئے گا ' مقامی آبادی ہمارے قابو میں آسکے گی۔

مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ہماری مستقل حکمت عملی بھی سخت بے بصیرتی پر مبنی رہی۔ کمانڈر

انچیف ایوب خان سمجھتے تھے کہ "اگر ہم مشرقی پاکستان میں اپنی تمام فوجی طاقت جمع کر دیں' تو بھی اس کا دفاع ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں مغربی پاکستان میں اپنی فوجی قوت کو مضبوط سے مضبوط بنانا چاہیے" (ڈان' ۱۸ جنوری ۱۹۵۵)۔ اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ قیام پاکستان کے ۲۵ سال بعد جب فوج کی ضرورت پڑی---- وہ بھی اپنے شہریوں کے خلاف---- تو مشرقی پاکستان میں ہمارے پاس کوئی بحریہ نہ تھی' اور صرف ایک ڈویژن انفنٹری' ایک اسکواڈرن ہوائی جہاز اور ایک ہوائی اڈہ تھا۔ حالانکہ مشرقی پاکستان میں ہر قدم پر ایک بی آر بی نہر تھی' اسے ناقابل تسخیر بنایا جا سکتا تھا بلکہ وہ مغربی پاکستان کی مدد کر سکتا تھا۔ ۱۹۶۵ میں بااثر بنگالی روتے تھے کہ ہمارے پاس دو ڈویژن رائفل بردار فوج بھی ہوتی تو ہم آسام کو ہندستان سے کاٹ سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے مشرقی پاکستان کو کھو دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگرچہ صحیح دفاعی حکمت عملی' مستقل یا وقتی' غلط سیاسی حکمت عملی کا مداوا نہیں کر سکتی تھی' لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ۱۹۵۳ سے ۱۹۷۱ تک دونوں حکمت عملیاں دو جنرلوں کے ہاتھوں میں تھیں۔

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ اگر ہم اسے ۱۹۴۸ میں نہ لے سکے تو ایک حد تک قابلِ فہم ہے۔ لیکن ۱۹۶۲ میں' جب چین نے ہندستان پر حملہ کیا تھا' ہم نے امریکہ کے بھرے میں آکر اسے حاصل کرنے کا ایک زرّیں موقع کھو دیا۔ ۱۹۶۵ میں ہم نے ایک بے سوچا سمجھا اقدام کیا' اور اسی لیے ۱۷ دن بعد سیز فائر قبول کرنا پڑا۔ آج بھی مجاہدین تو جان و مال اور آبرو کی بے مثال قربانیاں دے رہے ہیں' خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں' اور ہم ان تک مناسب امداد پہنچانے میں ناکام ہیں۔ اگر مجاہدین ناکام ہوگئے تو ہمیں کشمیر کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا۔

بھارت ہمارا اصل دشمن ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان فوجی اور صنعتی طاقت میں مہیب تفاوت پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا کیا حل ہے؟ دفاع' اب نیوکلیر صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں' لیکن ہم امریکی دباؤ میں اپنی افزودہ یورینیم کی پیداوار منجمد کر چکے ہیں۔

یہ خوفناک صورت حال' یہ مہیب مسائل' یہ جڑیں نہیں' شاخیں ہیں۔ اصل مرض' اور اصل بحران ایک ہی ہے: قومی کیرکٹر اور ایمان و اخلاق کا بحران---- سید مودودی کے الفاظ میں: "آپ برا نہ مانیں تو کہوں---- ہم نے ۱۹۴۷ میں آزادی حاصل تو کر لی' مگر ہمارے اندر قومی حیثیت سے وہ ابتدائی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوئے' جن کی بدولت کوئی قوم اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے"۔ بلکہ' وائے ناکامی! نہ صرف یہ کہ آج تک پیدا بھی نہیں کر سکے' جو تھوڑا بہت متاعِ کارواں تھا وہ بھی جاتا

رہا اور کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ صدر، وزیراعظم اور کمانڈر انچیف سے لے کر تھانے دار، پٹواری، لائن مین اور میٹر ریڈر تک، سب کھلم کھلا قانون شکنی کرتے ہیں، بدعنوانی کرتے ہیں، لوٹ کھسوٹ مچاتے ہیں، کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ بغیر ایمان و اخلاق کا سرمایہ جمع کیے، اور بغیر اس کے کہ قوم بیدار ہو کر اپنی حالت کی اصلاح خود کرے، ہمیں یقین کامل ہے کہ صورت حال میں کوئی بہتری پیدا نہ ہوگی۔

ہم ہزار مرثیے پڑھیں، ہزار نسخے تجویز کریں، کوئی علاج ممکن نہیں جب تک قوم کو یہ یقین مضطرب نہ کر دے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ناقابل قبول ہے، اسے بدلنا ناگزیر ہے، اور یہ صورت حال صرف ہمارے بدلنے ہی سے بدلے گی، کوئی مردے از غیب، کوئی معجزہ، کوئی حسنِ اتفاق، نظام میں کوئی تبدیلی، اس صورت حال کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوگی--- اس تبدیلی کی بنیاد اور نقطہ آغاز، ایمان اور اخلاق کے علاوہ کچھ نہیں۔ نہ سیاسی مفاہمت سے یہ بحران مستقل حل ہو گا، نہ سرمایہ کاری سے، نہ چہروں کی تبدیلی سے۔ پھر وہ اسی ایمان و اخلاق کی آرزو اور جستجو میں کوشاں ہو جائے۔

ایمان ایک قبلے اور ایک جہت کی طرف رخ کر لینے کا نام ہے، یکسو ہو جانے کا نام ہے، وفاداری کا نام ہے۔ ایمان بالباطل بھی ہو تو اس کی دنیا کے بازار میں ساکھ ہے، منافقت کی کوئی ساکھ نہیں۔ تقویٰ، اپنے مانے ہوئے ضابطہ اخلاق کی پابندی اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ ظلم، اسراف اور طغیان کا انجام تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں۔

آج ۴۸ ویں یوم آزادی کے موقع پر، اگر ہر قاری خود احتسابی کرے، اس بات کا عزم کرے کہ قوم کے ایک ایک فرد میں بدلنے اور تبدیلی لانے کا احساس اور عزم پیدا کرنے کے لیے وہ روز کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا، تو ہمیں یقین ہے کہ ہماری حالت میں تغیر نہ ناممکن ہے نہ دور کی بات۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے"۔ (الاعراف ۷: ۹۶)